Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر قیصر آفتاب احمد
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو یونی ورسٹی آف سیال کوٹ
طاہرہ غفور
اسکالر پی ایچ۔ڈی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

ناول امراؤ جان ادا کا موضوعاتی مطالعہ

Dr. Qaiser Aftab Ahmed
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Sialkot
Tahira Ghafoor
Scholar Ph. D International Islamic University, Islamabad

A Thematic Study of the Novel Amrao Jan Ada

Mirza Hadi Ruswa is one of the best Urdu prose writer. “Umrao-Jan-Adda” is the well known novel that reflects the muslim society in the nothren india. It depicts the picture of Lakhnavi society and socio-cultural values of that times. The article discusses the main issues of this society such as conflict between adapting the good or bad values, devaluation of cultural and conflict between dependent and inde-pendent powers. Ruswa’s attention is to portray the detailed picture of society of nineteenth century in Lakhnow. The most important is that it gives the whole image of social manner of society. It sheds light on the problem particularly faced by women and how they were forced to become prostitude. The forced to become prostitute. The narrative technique of this novel is somewhat unique.

Keyword: Lukhnavi Society, Conflict, Devaluation, Portitute, Narrative, Techniques.

امراؤ جان ادا کو اردو ادب میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ بہت کم ادبی شہ پاروں کے حصے میں آئی ہے۔ایک ن

Corresponding Author’s Email: qaisaraftab1972@gmail.com

اول نگار اپنی تحریر میں کرداروں کی زندگی کو پورے نشیب و فراز کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ ایک معنوں میں وہ ان کرداروں کی زندگی کا حقیقی معنوں میں مفسر ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ استدلال اور قوتِ مشاہدہ کے زور پر زندگی کی قریب ترین تصویر کو سامنے لاتا ہے اور یہی اس کی بہترین کردار نگاری کی دلیل ہے۔ ناول میں کردار نگاری ہی کے ذریعے زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے۔ ہر چھوٹا بڑا کردار قارئین ایک خاص تاثر چھوڑتا ہے اور جتنا یہ تاثر پائیدار ہو گا اتنا ہی کردار حقیقت کے قریب ترین ہوتا ہے۔ امراؤ جان ادا کا موضوع اودھ کا زوال ہے جسے مرزا ہادی رسوا نے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ہر موضوع کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں اور ناول نگار ان تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے واقعات کو فنی چابکدستی سے پیش کر دیتا ہے۔ امراؤ جان ادا کے مطالعے سے اس کا موضوع واضح ہو جاتا ہے۔ امراؤ جان ادا میں، صوبہ اودھ کے شہر فیض آباد کے خاندان سے ایک لڑکی امیرن جیل سے رہا پڑوسی ڈاکو دلاور خان کے ذریعہ اغوار کر لی جاتی ہے اور شہر لکھنو کے ایک کوٹھے میں خانم جان کو بیچ دی جاتی ہے۔ خانم جان طوائفوں کو ناچ گانے کی تربیت دیتی ہے، امیرن کا نام "امراؤ جان" رکھ دیا جاتا ہے اور اسے لکھنے پڑھنے اور ناچ گانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ امراؤ جان نواب سلطان سے محبت کرتی ہیں لیکن نواب سلطان اپنے خاندان والوں کی مرضی سے کسی اور سے شادی کر لیتا ہے۔ امراؤ کو ایک ڈاکو فیض علی پسند کرنے لگتا ہے اور امراؤ اس آرزو میں فیض علی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے کہ وہ اس سے شادی کرے گا۔ لیکن فیض علی کی گرفتاری کے بعد وہ پھر اکیلی رہ جاتی ہے۔ غدر کے بعد وہ فیض آباد چلی جاتی ہے اور اپنی ماں اور بھائی سے ملتی ہے لیکن امراؤ جان کو یہاں ایک اور دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا بھائی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گیا کہ امیرن نے اپنی مرضی سے تو یہ پیشہ اختیار نہیں کیا حالات کی ستم ظریفی نے اسے نگار خانے تک پہنچا دیا۔ امراؤ واپس لکھنو آجاتی ہے اور اس حقیقت کو قبول کر لیتی ہے۔

ناول میں درج ذیل موضوعات کو فنی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے:

خیر و شر کی کشمکش

امراؤ جان ادا سماجی،، معاشرتی، نفسیاتی اور تاریخی ناول ہے۔ اس میں انتہائی فکر انگیز حالات و واقعات کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ ناول حقیقت سے قریب ترین معلوم ہوتا ہے۔ ناول کے کردار جیتی جاگتی دنیا کے رہنے والے ہیں اور ہمارے ارگرد کے تمام انسانوں جیسی خوبیوں اور خامیوں کے مالک ہیں۔ رسوا نے امراؤ جان ادا میں کسی کردار کو مثالی بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ کرداروں کو اس طرح سے سامنے لایا گیا ہے کہ زندگی کے حالات و واقعات سے ان پر گہرا اثر ظاہر کر سکیں۔ کرداروں میں خیر و شر کو اس طرح دکھایا گیا ہے جیسے حقیقی زندگی میں انسان کو لمحہ بہ لمحہ ان حالات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

امراؤ جان ادا کے کردار کی اچھائی ظاہر کرنے کے لیے دوسری طوائفوں کے کردار بھی پیش کیے گئے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امراؤ جان طوائف ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی فطرت کی مالک ہے۔ اور نیکی اور بدی کی تمیز رکھتی ہے اور جب اس کے حالات اجازت دیتے ہیں تو وہ اچھی صفات پر قائم بھی رہتی ہے۔ ڈاکٹر عبد السلام امراؤ جان کی فطرت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"اس کی فطرت کا کمال یہ ہے کہ وہ طوائف ہونے کے باوجود انسان بھی نظر آتی ہے۔ وہ حالات کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتی مگر اس کی اعلیٰ تعلیم نے اس میں خیر و شر کا امتیاز ضرور پیدا کیا ہے۔"(1)

اگر چہ امراؤ بہت سی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ خوبصورت ہے، گانے میں ماہر ہے، علم شناس ہے لیکن اس کے باوجود وہ طوائف کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نہیں ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اس میں دوسری طوائفوں کی سی مکاری اور عیاری نہیں ہے۔ اسے گناہ و ثواب کا شعور ہے اور جہاں تک ہو سکے وہ اس پر عمل کرتی ہے۔ ناول میں امراؤ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتی ہے۔

"عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے۔ دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری ناقص رائے میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں۔"(2)

امراؤ جان ادا کو باقاعدہ طور پر تو طوائف بنا دیا گیا لیکن فطری طور پر وہ کبھی بھی طوائف نہ بن پائی۔ کیونکہ اس میں نہ بسم اللہ جان کی طرح مکاری تھی اور نہ خانم جان کی طرح شاطرانہ پن۔ خاندانی شرافت اور علم سے آگہی کی وجہ سے اس میں کبھی بھی بے باکی پیدا نہ ہو سکی۔ اس میں وضع داری تھی۔ اس کی نظر گاہکوں کی جیب کی بجائے ان کے اخلاق پر ہوتی تھی۔ بقول ڈاکٹر توحید خان:

"اپنے زمانے اور ماحول سے مطابقت اور خیر و شر کی کشمکش نے اس کردار کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔"(3)

رسوا نے امراؤ کا کردار تمام تر باریکیوں کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں اعمال و عقائد کی کشمکش کو نمایاں انداز میں دکھایا گیا ہے۔

خیر و شر کے تصادم کے ضمن میں نواب سلطان کا کردار بھی بہت اہتمام سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ صورت اور سیرت کے لحاظ سے اچھے کردار کے مالک ہیں۔ انہیں رسوائی کا اتنا خیال ہے کہ طوائف کے کوٹھے پر اکیلے اور دن کی روشنی میں جانا پسند نہیں کرتے۔ نواب سلطان میں خیر و شر کی کشمکش کے بارے میں میمونہ بیگم لکھتی ہیں:

"نواب سلطان ناول کے ہیرو ہیں۔ اس ناول کی اندھیاریوں میں وہ صبح کے ستارے کی طرح طلوع سحر کی خبر دے رہے ہیں۔ خیر و شر کی کشمکش میں خیر کی طرح کامیاب و بامراد ہیں۔"(4)

ناول میں خیر و شر کے تضاد کو واضح کرتے ہوئے رسوا آنوابین کی بڑی مضحکہ خیز تصویر پیش کرتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ برائی جب عام ہو جائے تو برائی نہیں لگتی اور معاشرہ اس قدر دگرگوں حالت تک پہنچ جاتا ہے کہ برائی میں بھی فخر محسوس ہونے لگتا ہے رسوا لکھتے ہیں کہ:

"پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں تو انھیں اخفائے راز کا اس قدر خیال ہوتا ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے۔۔۔ مگر رفتہ رفتہ یہ حالت تو بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ چند ہی روز میں۔۔۔ بے غیرت ہو جاتے ہیں ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔"(5)

خیر اور شر کی بات کریں تو خانم کا کردار بھی اہم کردار ہے۔ خانم بہت رکھ رکھاؤ والی عورت ہے جو لوگوں کو اپنے دام میں پھنسانے کے گر جانتی ہے وہ ایک خالص کاروباری عورت ہے لیکن بعض جگہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اس کے دل میں خوف خدا ابھی چھپا ہوا ہے۔ گناہ کے وقت اس کا ضمیر اسے احساس دلاتا ہے لیکن وہ اس قدر مشتاق عورت ہے کہ ضمیر کی تسکین کا جواز بھی ڈھونڈ لیتی ہے۔ وہ تمام عذاب و ثواب ان لوگوں کی گردن پر ڈال دیتی ہے جو بردہ فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور خود کو بری الذمہ سمجھتی ہے جیسے ناول میں امیرن کو خریدنے کے بعد کہتی ہے:

"خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انھی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے ہم سے کیا آخر۔ یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔"(6)

خانم کا کردار متضاد کیفیتوں کا حامل دکھایا گیا ہے۔ وہ مذہب پرست بھی ہے۔ امراؤ اس کی دین داری کے بارے میں کہتی ہے کہ:

"خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔"(7)

اور مزید اس کی فیاض طبیعت کے بارے میں کہتی ہے کہ:

"عاشورے کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ کشی کی جاتی تھی۔"(8)

یہ سب نیکیاں ایک طرف لیکن دوسری طرف عصمت فروشی اس کا پیشہ تھا خیر و شر کی اس کش مکش کو ڈاکٹر توحید خان ان الفاظ میں لکھا کرتے ہیں:

"خانم کے کردار میں خیر و شر کی یہی کش مکش اسے ناول کا ایک زندہ جاوید کردار بناتی ہے۔"(9)

ناول میں خورشید جان کا کردار ایسا کردار ہے جو خیر و شر کے تصادم کو نمایاں انداز میں پیش کرتا ہے۔ خورشید جان کی رگوں میں شریف خون ہے۔ اس کا ضمیر اسے گناہ اور ذلت پر ملامت کرتا رہتا ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی اسے کوٹھے تک تو لے آتی ہے لیکن وہ بہت مجبوری میں یہ کام کرتی ہے۔ بقول امراؤ جان ادا اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں پیدا کرتی۔'' (10) لیکن خورشید کو گناہ و ثواب کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے خیالات کا اظہار کرتی ہے کہ کسی ایک کی ہو کر رہے اور وہ ہر وقت اسی ذہنی کش مکش میں رہتی ہے۔ پیشہ ورانہ روایات سے انحراف کرتی ہے۔ گاہکوں سے بے رخی سے پیش آتی ہے اور جب اسے اس دلدل سے نکلنے کا موقع ملتا ہے تو خوشی خوشی اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ عیش باغ کے میلے میں وہ اغو ہو جاتی ہے اور اس موقع پر وہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتی کیونکہ اسے خانم سے نجات مل رہی ہوتی ہے۔ روز روز کے گاہکوں کے بجائے اب اس کا واسطہ صرف ایک شخص سے رہے گا۔ اس کے لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کیوں کہ اس سے زیادہ اسے مختاری حاصل نہ تھی۔

رسوا اکبر علی خان کی جعل سازی اور بری شخصیت بتانے کے بعد اس کی اچھائی کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ امراؤ جان جب نواب محمود کے دعویٰ زوجیت کی وجہ سے مشکل حالات سے گزر رہی تھی۔ تو اکبر علی خان نے اسے بغیر کسی لالچ کے ان حالات سے نکالا۔ ناول میں مختلف کرداروں کے حالات و واقعات سے رسوا خیر و شر کے تصادم کو واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عمل و عقائد کی یہ کش مکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت:

ناول امراؤ جان ادا لکھنو کی زوال پذیر تہذیب کے ظاہری رکھ رکھاؤ کا عکاس ہے جہاں تعیش پسندی کو فوقیت حاصل تھی۔ خانم کی سج دھج اور رکھ رکھاؤ لکھنو کی پوری تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ خانم کے کردار میں اس دور کی طوائفوں کی صورت دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں اپنوں کی عیاشی نے ہزاروں طوائفوں کو جنم دیا اور طوائفوں کے یہ کوٹھے تہذیب و معاشرت کی جڑوں میں سیم و تھور کا کام دے رہے تھے۔ بوا حسینی جو اس شطرنج کا ایک مہرہ ہے، امراؤ کے لیے محبت کا جذبہ رکھتی ہے اور صرف پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر اس مکروہ کاروبار میں خانم کا ساتھ دے رہی ہے۔ یہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ کس طرح معاشرہ میں عورت کی معاشی بے بسی اسے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگرچہ بوا حسینی نیک سرشت عورت ہے لیکن معاشی بدحالی کی وجہ سے اس ماحول سے وابستہ ہے۔ رسوا کے تمام چھوٹے بڑے کردار معاشرتی رویوں کی غمازی کرتے ہیں۔ انھوں نے غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کی سماجی و معاشی زبوں حالی کو بڑے متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔ شاہی شان و شوکت ختم ہو چکی ہے، عیش و عشرت کی محفلیں اجڑ چکی ہیں، عوام میں مایوسی کی لہر دوڑ رہی ہے

، لیکن پھر بھی نوابی خمار ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے ہیں، کاہلی اور سستی رگ رگ میں بسی ہوتی ہے اور محنت و مشقت کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ رسوا نے ان سب حالات و واقعات سے نہ صرف تہذیبی شکست و ریخت کو ظاہر کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ امید کی کرن دکھانے کی بھی کوشش کی ہے اور رہنمائی کے لیے ایسے کردار پیش کیے ہیں جو حالات کا بھرپور مقابلہ کرتے ہیں۔ رسوآ نے ان کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے جو اس تہذیب کی شکست کا باعث بنیں۔ لکھنؤ کی سماجی، معاشی اور اخلاقی قدروں کی تباہی ہی ناول کا موضوع ہے۔ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس بیمار تہذیب کے پروردہ اس قدر کاہل ہیں کہ ان میں اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھالنے کی بھی صلاحیتیں نہیں۔ رسوآ نے تہذیبی اقدار و روایات کو ماحول اور معاشرے کے پس منظر میں اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ لکھنو کی زوال پذیر اقدار میں مرد، عورت کے تعلق سے دو متوازی زندگیاں گزار رہا ہے۔ ایک گھریلو زندگی اور دوسری کوٹھے کی عیش و عشرت کی زندگی۔ یعنی عورت کی معاشرے میں دو ہی حیثیتیں ہیں ایک بیوی اور دوسری معشوقہ۔ رسوآ نے طوائف کے آئینے میں لکھنؤ کی شکست و ریخت کو دکھایا ہے کہ کس طرح اس تعیش پسند معاشرے کی پیدا کردہ طوائفیں بظاہر قابل نفرت ہونے کے باوجود زندگی پر چھائی ہوئی ہیں ان کے دم سے محفلیں آباد ہیں۔ اس کے سامنے شریف و رزیل، عالم و جاہل سب پانی بھرتے ہیں۔ وہ چاہے جہاں دیدہ مولوی صاحب ہوں یا ڈاکو لٹیرے غرض ہر طبقے کا نمائندہ انھیں داد عیش دے رہا ہے۔ اقدار کی شکست و ریخت طوائف کی جسمانی شکست و ریخت سے ظاہر کی گئی ہے۔ امراؤ کے وسیلے سے لکھنو کی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے جو روبہ زوال ہے۔ "امراؤ ایک ناشاد، آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگِ خاندان۔"(11) جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ زمانے کی ستائی ہوئی ہے۔ سماج نے اسے ہر طرح سے لوٹا ہے اور پھر کسی بھی رشتے میں عزت دینے کے لیے تیار نہیں ہے طوائف جانتی ہے کہ وہ صرف اور صرف ہوس پرستی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا امراؤ اپنی ہم پیشہ عورتوں کو نصیحت کرتی ہے کہ "اے بے وقوف رنڈی اس بلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تمھیں سچے دل سے چاہے گا۔"
(12)

"امراؤ جان ادا" تہذیب کی شکست و ریخت کی عکاسی کرتا ہے اس کا موضوع سوانح عمری نہیں بلکہ لکھنو ہے۔ ناول نگار کا مقصد صرف کرداروں سے متعارف کروانا ہی نہیں بلکہ ناول نگار کے پیش نظر معاشرتی اقدار کی تصویر کشی ہے۔ اسے کردار نگاری سے صرف اس حد تک دلچسپی ہے کہ وہ معاشرے کی تہذیب کی بہتر انداز میں تشہیر کر سکے۔ بقول ڈاکٹر فاروق عثمان:

"ایسا تو کرنا پڑتا ہے کہ کسی بھی ہیئت اجتماعیہ کے میلانات اور رجحانات کے اظہار کے لیے چند مخصوص افراد کو منتخب کر لیا جاتا ہے لیکن بذاتیہ ان کا مطالعہ اتنا گہرا اور ہمہ جہت نہیں ہوتا جتنا (اجتماعی ناول کے علاوہ) دوسرے ناولوں میں ہوتا ہے۔ فرانسیسی ناول نگار زولا اور بالزاک کے ہاں بھی یہی صورتحال نظر آتی ہے۔"(13)

ڈاکٹر عثمان فاروق کے مطابق رسوا ایک اجتماعی ناول تحریر کر رہے تھے اور اجتماعی ناول پورے معاشرے کی دستاویز فراہم کرتی ہے۔ مرزا رسوا کے پیش کردہ ہر چھوٹے بڑے کردار کے دورخ ہیں کہ جو نہ صرف اپنی بلکہ معاشرتی زندگی کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔

معاشرتی ناول میں کرداروں کو ان کے مکمل افعال وواقعات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کی بھی کوشش کی جاتی ہے کہ ان حالات کے پس منظر کو بھی سامنے لایا جا سکے۔ جیسا کہ "امراؤ جان ادا" میں روزمرہ زندگی کے واقعات سے معاشرتی ہنگامہ خیزی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے معاشرتی اقدار حسن کا نہیں "فریب حسن"(14) کا تاثر دیتی ہے، قاری اس تاثر میں گھرا رہتا ہے۔ ناول میں بیان کیے گئے رسوم ورواج میں معاشرہ شکست وریخت کا شکار نظر آتا ہے اور تھکی تھکی قدریں معاشرے کو مزید مضمحل کیے ہوئے ہیں اور اس کے نتیجے میں نہ کوئی تناسب ہے اور نہ توازن۔ شکست خوردہ اقدار معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانے سے قاصر ہیں۔ بظاہر ناول کا موضوع طوائف بنا کر رسوا نے معاشرتی اقدار کی شکست وریخت کو عیاں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں سے خاص طور پر امراؤ جان ادا کو اپنے زمانے کی تاریخ کہا ہے۔

مجبوری اور مختاری کا تصادم:

امراؤ جان ادا کے کردار زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے حقیقت سے متعارف کرواتے ہیں، یہ قدرت کے سامنے اسی طرح مجبور اور بے بس نظر آتے ہیں جیسے ہمارے اردگرد کے چلتے پھرتے لوگ حالات زندگی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر ناول کے کردار آغاز سے انجام تک "سب اچھا ہے"، کی مثال پیش کرتے تو کہانی میں مصنوعی پن محسوس ہوتا۔ زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے فطری قضیہ نہ ہوتا تو ان کی حیثیت مٹی کے مادھو کی سی ہوتی۔ کہانی کا پلاٹ بالکل سپاٹ ہو جاتا اور ارتقائی کیفیت بھی مفقود ہو جاتی۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی یہ کسی ناول کی کمزوری ہوتی ہے کہ کہانی کو میکانکی انداز میں پیش کیا جائے۔ امراؤ جان ادا فنی لحاظ سے مکمل ناول ہے لہٰذا ہمیں اس میں مختلف جگہوں پر مجبوری اور مختاری کا تصادم نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں امراؤ جان ادا کے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ اگرچہ معاشرہ طوائفوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے مگر پھر زندگی ان کے بغیر بھی نہیں گزر رہی تھی۔ امراؤ جان نواب سلطان سے سچی محبت کی

خواہاں تھی لیکن قسمت اس پر مہربان نہ تھی اور وہ ناکام و نامراد رہ جاتی ہے۔ لیکن اس سبب کے باوجود امراؤ جان زندگی سے ہار نہیں مانتی۔ وہ ابھی بھی زندگی سے اچھے کی امید باندھے ہوئے ہے۔ ڈاکو فیض علی اسے گھریلو زندگی کا حسین خواب دکھا کر اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے تو وہ پھر سے امید کے چراغ روشن کر لیتی ہے۔ لیکن فیض علی کی گرفتاری کے بعد اس کے گھریلو زندگی کے خواب بکھر جاتے ہیں۔ خانم کے پاس واپس جانا اس کی خودداری پر ضرب تھا۔ لہٰذا وہ کانپور میں ہی مولوی صاحب کی وساطت سے زندگی کی جدوجہد شروع کر دیتی ہے۔ کانپور میں اس کی ملاقات رام دئی سے ہوتی ہے۔ جو اس کے ساتھ ہی بچپن میں اغوا ہوئی تھی لیکن کسی بیگم کے ہاں فروخت ہو جاتی ہے اور جب امراؤ کو پتہ چلتا ہے کہ رام دئی نواب سلطان کی بیگم صاحبہ ہیں تو اسے اپنی قسمت کے کھوٹے ہونے پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی ہے امراؤ اپنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

"جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آتا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر بکی بھی تو کہاں رنڈی کے گھر۔"(15)

امراؤ جانتی تھی کہ طوائف کی زندگی مجبوری کی زندگی ہے۔ سماج نے اس سے مختاری کا حق چھین لیا ہے اور اس کی لاکھ کوشش کے باوجود اسے کسی اور حیثیت سے قبول کرنے سے انکاری ہے۔ اسی لیے وہ اپنی ہم پیشہ عورتوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ اپنی مجبوری سے سمجھوتہ کرے اور کسی کے دھوکے میں نہ آئے۔ امروٗجان فیض آباد میں اپنی ماں اور بھائی سے ملتی ہے تو پھر اپنی قسمت پر ماتم کرتی ہے کہ قسمت نے اسے گھر سے کوٹھے پر لا بٹھایا۔ اپنوں کی سچی محبت سے محروم کر کے جھوٹی محبتوں کے دام میں پھنسا دیا۔ سوائے افسوس کے، اس کے اختیار میں کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر توحید خان امراؤ کی زندگی کے اس مقام کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"امراؤ جان کی زندگی میں یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں وہ اپنے ماضی اور حال کے درمیان کی خلیج کو بڑی شدت سے محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنے پیشے سے نفرت ہو جاتی ہے مگر اس میں سماج سے بغاوت کی ہمت نہیں۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ سماج میں اس کے لیے کوئی اور صورت (Alternative) نہیں ہے۔ لہٰذا وہ حالات کے آگے سر ڈالنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ (16)"

فیض آباد سے واپسی سے اسے لکھنؤ میں دوبارہ وہی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے تو اسے زندگی کی محرومیوں کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اکبر علی خان کے گھر میں لڈن کی ماں اسے جس طرح ذلیل کرتی ہے۔ امراؤ کی نظر میں "انسانیت سے بعید ہے"(17) اسے اپنی مجبور زندگی پر ہمیشہ کسک محسوس ہوتی ہے وہ خانم کی دنیا سے بیزار ہے مگر سماج بھی اسے عزت کے ساتھ

کوئی مرتبہ دینے کو تیار نہیں۔ لہٰذا وہ اسی زندگی سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے۔ تقدیر کے لکھے کو قبول کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ تقدیر کے بارے میں امراؤ کا خیال ہے کہ:

"جب کسی کو کسی بات کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے۔ "اوہ جی جو تقدیر میں ہو گا ہو کے رہے گا۔" اس کا مطلب ہے جو ہم چاہیں کریں ہمیں نہ روکو۔۔۔ جو کچھ ہو گا تقدیر سے ہو گا۔ جو نتیجہ نکلے گا وہ معاذاللہ خدا کی طرف سے ہو گا۔"(18)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امراؤ مجبوری کے ساتھ ساتھ مختاری پر بھی یقین رکھتی ہے یعنی صرف تقدیر کا لکھا کہہ کر قبول نہیں کرنا چاہیے زندگی میں کوشش شرط ہے۔ کوشش سے اللہ بہتری کی راہیں نکال دیتا ہے لیکن جب اس کا بھائی اس کی گردن پر چھری رکھتا ہے تو وہ بغیر کسی کشمکش کے مرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ یہاں عورت کی فطری کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ شکست خوردگی کا احساس اس میں سے جینے کی آرزو بھی ختم کر دیتا ہے۔ رسوا عورت کی اس فطری کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گھریلو نیک بختیں بھی اپنے مردوں کو الزام دینے کے بجائے طوائفوں کو ہی مجرم ٹھہراتی ہیں اور جواز یہ پیش کرتی ہیں کہ انھوں نے کسی قسم کا جادو ٹونہ کر کے ان کے مردوں کو فریفتہ کیا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ بھی مجبور ہیں اور جانتی ہیں کہ سر اٹھانے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ ڈاکٹر عبدالسلام اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

"کونین کی گولی پر شکر اس طرح لپٹی ہے کہ بڑے بڑے ضدی بچے بھی اسے دیکھ کر پھسل پڑیں اور مچل مچل کر اس کی طرف لپکیں۔"(19)

امراؤ جان کے کردار میں باغیانہ روش کی کمی نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ طوائف ایک حد تک ہی خود مختار ہوتی ہے۔ اگرچہ خورشید کے کردار میں یہ جوش نظر آتا ہے اور اس کی یہ بغاوت اسے کوٹھے سے نکال کر زیادہ سے زیادہ ایک رئیس کے ہاں پہنچا دیتی ہے۔ البتہ بسم اللہ جان کا کردار ایسا کردار ہے جسے ہم کافی حد تک خود مختار کردار کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں نام کی بھی مروت موجود نہیں ہے۔ نواب چھبن سے اسے محبت ہونے لگی تو یہ جان کر کہ وہ اب اس کی فرمائشیں پوری کرنے سے مجبور ہو چکے ہیں۔ فوراً متنبہ ہو جاتی ہے اور ان سے آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ وہ ایک ہی موقع پر باپ اور بیٹے سے لگاوٹ کر سکتی ہے۔ ستر سالہ صاحبِ علم مولوی صاحب کو درخت کی پھننگ تک چڑھا سکتی ہے۔

ناول میں خانم کو بھی وہ اقتدار حاصل ہے کہ بڑے بڑے نواب اس سے ڈرتے ہیں۔ بیگمات خانگی معاملات میں اس کی صلاح سے چلتی ہیں۔ اس میں سمجھ بوجھ اور وقت شناسی کی صلاحیت ہے۔ اسے صرف اور صرف پیسے سے محبت ہے۔ وہ خالص کاروباری عورت ہے۔ نواب چھبن کی غربت میں اسے دوٹوک جواب دے کر رخصت کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ:

"بیسوائیں چار پیسے کی میّت ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو۔ ہم لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا۔"(20)

خانم ایک خود مختار عورت ہے وہ پیشہ وارانہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقفیت رکھتی ہے اور معاشی مفاد کی خاطر اپنی نوچیوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔

نواب سلطان کا کردار مجبوری اور مختاری کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ رسوآنے اس کردار کی تعمیر میں بڑے اہتمام سے کام لیا ہے۔ وہ محتاط بھی ہیں اور روشن خیال بھی۔ زمانے کی چال دیکھتے ہوئے وہ غدر کے اثرات سے بچنے کے لیے انگریزوں سے اچھے مراسم رکھتے ہیں۔ رسوائی کے خیال سے بچتے ہیں لیکن کوٹھے پر بھی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام نواب سلطان کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ان (نواب سلطان) میں بتوں کو توڑنے کی ہمت نہیں اور نہ بتوں کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ ہے۔ وہ اپنا ہاتھ دلائی میں چھپائے رہتے ہیں اور بیوی کے سامنے امراؤ جان کو کنکھیوں سے دیکھتے اور خاموش رہتے ہیں۔"(21)

مجبوری اور مختاری کے ضمن میں اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ طوائف چاہے کتنی ہی خود مختار ہو جائے، تعلیم و ترقی کی مدارج طے کرلے، نوابین کے خلوت خانوں تک پہنچ جائے یا شاہ اودھ کے دربار تک رسائی حاصل کرلے، اس کے باوجود اتنی خود مختار نہیں ہو سکتی کہ سماج سے ٹکرلے اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کر سکے۔ قسمت کی خدائی کو بہر حال ہر صورت قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نورالحسن تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"امراؤ جان ادا کے مطالعے سے ہارڈی کی ٹیس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ امراؤ جان ادا اور ٹیس میں بہت زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ دونوں کی خانہ خرابی محض قسمت کی وجہ سے ہوئی یعنی دونوں بذات خود برائی کے راستے پر چلنے کی وجہ سے طوائف نہیں بنی بلکہ دنیا زبردستی انہیں گناہ کے راستے پر چلاتی ہے۔"(22)

یہ قسمت کے سامنے مجبور ہیں اور ان میں اتنی سی بھی خود مختاری نہیں کہ معاشرے میں اپنی عزت کروا سکیں۔ ویسے ہی جیسے کوٹھے پر آنے والے نوابین اپنی تمام تر عیاشیوں کے باوجود معاشرے کے اشرافیہ کی حیثیت سے باوقار زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

1. عبدالسلام۔ اردو ناول بیسویں صدی میں۔ ص۱۴۸
2. مرزا محمد ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ ص۲۱۰
3. توحید خان۔ مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار۔ (نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۵ء)، ص۹۱
4. میمونہ بیگم مارھروی۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ ص۲۳۷
5. مرزا محمد ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ ص۲۲۵
6. ایضاً، ص۵۵
7. ایضاً، ص۱۰۷
8. ایضاً
9. توحید خان۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار۔ (نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۵ء)، ص۹۴
10. مرزا محمد ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ ص۱۳۴
11. ایضاً، ص۳۸
12. ۵۱۔ ایضاً، ص۲۶۷
13. فاروق عثمان۔ اردو ناول میں مسلم ثقافت۔ (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۲ء)، ص۲۲۲
14. ایضاً، ص۲۲۴
15. مرزا محمد ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ ص۲۴۲
16. توحید خان۔ مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار۔ ص۹۰
17. مرزا محمد ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ ص۲۲۲
18. ایضاً، ص۲۶۱
19. عبدالسلام۔ اردو ناول بیسویں صدی میں۔ (کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۷۳ء)، ص۱۵۳
20. مرزا محمد ہادی رسوا۔ امراؤ جان ادا۔ ص۱۲۰
21. عبدالسلام۔ اردو ناول بیسویں صدی میں۔ ص۱۵۲
22. محمد احسن فاروقی۔ نورالحسن ہاشمی۔ ناول کیا ہے؟ (لکھنؤ: نظامی پریس، ۱۹۹۰ء)، ص۱۴۸